پاکستان میں

سیاسی ہم آہنگی اور اُس کی تدابیر

نظریۂ پاکستان کی روشنی میں

محمد نذیر کاکاخیل

نظریہ پاکستان کی بنیاد اسلامی نظریۂ حیات پر رکھی گئی ہے پیغمبر انسانیت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی ہدایات کی روشنی میں زندگی کا جو تصور پیش کیا اور جس پر عمل کر کے دنیا کے سامنے ایک مثالی نمونہ پیش کیا اس کی رو سے زندگی نام ہے باہمی اشتراک، تعاون، ہم آہنگی ہمدردی اور مؤاساۃ کا نہ کہ باہمی کشمکش اور جنگ وجدال کا یہی وجہ ہے کہ اسلامی فلسفۂ حیات کے مطابق زندگی کے ہر شعبے میں وحدت فکر کی دعوت ہے۔ یہ فکر روحانی ہو، علمی ہو، معاشرتی ہو، معاشی ہو یا سیاسی۔ اسلامی تعلیمات کا مقصد زندگی کے مختلف شعبوں میں ربط وارتباط اور یک جہتی وہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ اسلام نے انہی تعلیمات کی بدولت ایسے وقت جبکہ انسانیت رنگ، نسل اور زبان کی وجہ سے متخاصم گروہوں میں بٹی ہوئی تھی، تعصب اور تفریق کے بت پاش پاش کر کے انسانی مساوات کا عملی نمونہ پیش کیا اور ایک عالم گیر انسانی برادری کی طرح ڈالی۔

کسی بھی نظام فکر میں ریاست وسیاست لازم وملزوم ہوتے ہیں لیکن اسلامی ریاست میں سیاست ہمیشہ دین کے تابع ہوتی ہے۔ اور دین اسلام معاشرتی ہم آہنگی پر زور دیتا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک طرف اگر فرد کے جسم وروح یا زندگی کی مادی اور روحانی قدروں میں وحدت برقرار رکھی ہے تو دوسری طرف اس بات کا بھی اہتمام کیا کہ معاشرتی زندگی میں مذہب وسیاست کے رستے جدا جدا نہ ہوں۔ روحانیت کے ساتھ ساتھ سیاسی میدان میں بھی فرد اور ملت کے مقاصد ایک ہوں اور ان میں مقصد کے اعتبار سے باہم کشمکش نہ ہو۔ دراصل یہ مذہب وسیاست میں مکمل ہم آہنگی

ہی کا تصور تھا جس نے ساتویں صدی عیسوی کے عربوں کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب برپا کر کے انہیں نسل پرستی، فرقہ بندی اور قبائلی عصبیت سے نکال کر عالم گیر انسانی برادری کا علمبردار بنا دیا۔

عہد حاضر کے بیشتر مسائل اور مصائب کی اصل وجہ ہی یہ ہے کہ ہم اپنے مرکز ثقل سے ہٹ گئے ہیں، ہم نے مادیت کو روحانیت پر ترجیح دی ہے اور اخلاقی اقدار کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اس وقت مسلم دنیا میں جو ذہنی انتشار اور سیاسی بے چینی پائی جاتی ہے، اس کی بنیادی وجہ مذہب سے بیگانگی اور مادیت میں استغراق ہے حالانکہ اسلامی نظام فکر میں روح کو مادہ کی یا مادہ کو روح کی بھینٹ نہیں چڑھایا جاتا۔ بلکہ دونوں میں ایک حسین امتزاج اور توازن برقرار رکھا گیا ہے۔

اپنی بقاء کے تحفظ اور مادیت کے عظیم طوفان کے پیش نظر اسلام کی ترقی و سربلندی کے لئے اس وقت کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ ہم پاکستانی مکمل سیاسی ہم آہنگی کا مظاہرہ کریں اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں اور قومی حصار کی بنیادوں کو اور مضبوط کریں۔ تاکہ عالم گیر انسانی برادری کی کوششوں میں بھرپور حصہ لے سکیں۔ اسلام اگر ایک طرف ایک ہی ملت کے مختلف گروہوں کے مفاد و مصالح میں ہم آہنگی پر زور دیتا ہے تو دوسری طرف انسانی برادری کی مختلف قوموں کے درمیان چھوٹے چھوٹے اور محدود مصالح میں اختلاف کے باوجود مقصد کے اعتبار سے اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے کی کوششوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ سیاسی ہم آہنگی کیا ہے؟ اسلام کیوں سیاسی ہم آہنگی پر زور دیتا ہے اور پاکستان میں، جو کہ بیسویں صدی عیسوی میں ایک جدید اسلامی ریاست کا داعی ہے، اس کی اہمیت و افادیت کیا ہے؟ کیوں اس وقت سیاسی ہم آہنگی کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے؟

آسان اور مختصر الفاظ میں سیاسی ہم آہنگی کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے: ملکی استحکام و سالمیت، قومی فلاح اور ملی اتحاد و اتفاق سے متعلق اہم مسائل پر (جن پر آپس میں بنیادی اختلافات کی وجہ سے ملکی سالمیت یا قومی مفادات کو نقصان کا اندیشہ ہو)، مختلف الخیال سیاسی جماعتوں اور "اہل الحل والعقد" کی متفقہ رائے، سیاسی ہم آہنگی کہلاتی ہے۔ سیاسی ہم آہنگی کے لئے یہ قطعاً ضروری نہیں کہ ہر چھوٹے بڑے مسئلے پر اتفاق رائے ہو۔ اختلاف رائے کے باوجود عظیم تر قومی مفادات،

ملکی سلامتی واتحاد کو ملحوظ رکھ کر افہام وتفہیم، باہمی اعتماد، رواداری اور احساس ذمہ داری کا ثبوت دیا جائے اور اہم مسائل کو ذاتی پسند وناپسند سے نہیں بلکہ قومی نقطۂ نظر سے مثبت انداز میں حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ سیاسی ہم آہنگی کا مظاہرہ یک جماعتی نظام میں بھی ہو سکتا ہے اور کثیر جماعتی نظام میں بھی۔ پاکستان کی مخصوص آئیڈیالوجی اور بنگلہ دیش کے قیام کے پیشِ نظر اس وقت سیاسی ہم آہنگی کی شدید ضرورت ہے کیونکہ دشمنان اسلام اور اعدائے پاکستان اس تاک میں بیٹھے ہیں کہ کب (خدانخواستہ) قومی اتحاد میں رخنے پیدا ہوں اور وہ اپنے مذموم اور ناپاک عزائم میں کامیاب ہوں۔

ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام زندگی کے ہر شعبے میں مکمل یک جہتی اور ہم آہنگی پر زور دیتا ہے۔ امّتِ مسلمہ نے قرآن وسنت نبوی کی روشنی میں ایک اعلیٰ، معیاری اور اخلاقی زندگی کے حصول کی ذمہ داری ریاست کے سپرد کی ہے۔ ریاست کا انتظام چلانے کے لئے شوریٰ کو لازمی قرار دے دیا گیا ہے[۷] لہٰذا ریاست یہ مقاصد اس وقت حاصل کر سکتی ہے جب اس کے اندر مکمل سیاسی ہم آہنگی کا مظاہرہ ہو۔ احادیث میں جو بہت سی روایات اطاعت امیر پر تاکید کرتی ہیں[۸] تو اس تاکید کا ہرگز یہ مفہوم و مطلب نہیں کہ اسلام اپنے مخصوص انداز کی جمہوریت کی نفی یا ضد ہے یا یہ کہ اس کا جھکاؤ ملوکیت کی طرف ہے بلکہ رسول کریمؐ کے ان اقوال میں یہ فلسفہ کارفرما ہے کہ سیاسی اختلافات اور محاذ آرائیوں سے حتی الوسع اجتناب کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی کا مظاہرہ کیا جائے تاکہ قوم افتراق وانتشار سے بچ جائے۔ البتہ یہ ایک قابلِ ذکر بات ہے کہ اسلام میں اطاعت امیر اَلْاَمْرِ بِالْمَعْرُوْفِ اور نَہْیِ عَنِ الْمُنْکَرْ میں واجب ہے معصیت میں ہرگز نہیں۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے:

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ....[۹]

ترجمہ:- نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تعاون کیا کرو اور گناہ وزیادتی میں تعاون مت کرو۔

اس میں شک نہیں کہ ملوکیت کے دور میں امام غزالیؒ اور ابن جماعہ[۱۰] ایسے قابلِ ذکر

مسلمان مفکرین نے عظیم تر قومی وحدت کی خاطر امام جائر کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے، ہر حال میں امام کی اطاعت کرنے یا مسلمانوں کی مرضی کے بغیر مسلط ہونے والے حکمران کی حکم عدولی نہ کرنے پر زور دیا ہے لیکن اس قسم کی باتیں خاص مصلحتوں کے تحت کی گئیں۔ اسلامی اصول حکمرانی ایسا کرنے سے انہوں نے اسلام کے حکمرانی کے اصولوں سے انحراف نہیں کیا اور نہ عوام کو الانعام سمجھ کر دبانے کی حوصلہ افزائی کی بلکہ اپنے زمانہ کے مخصوص معاشرتی و سیاسی حالات کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ عام لوگوں کی علمی یا سیاسی سوجھ بوجھ کی کمی کی وجہ سے فروعی اختلافات امت کی وحدت اور ملکی سالمیت کے لئے خطرے کا باعث بن سکتے ہیں۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ملوکیت کے دور میں اطاعت امیر پر زیادہ زور اس لئے بھی دیا جانے لگا تاکہ حکمران طبقہ کو مذہب کی آڑ میں مزید من مانی کارروائیوں کے مواقع میسر آئیں حالانکہ علمائے حق اگر رسول اللہ صلعم کے اقوال کی رو سے اطاعت امیر پر مُصر تھے تو ان کا مقصد ملت کو انتشار اور افتراق سے بچانا تھا نہ کہ سیاسی اختلافات کو ہوا دے کر ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا۔ امام نووی کے قول کے مطابق ان روایات کی روح یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کی وحدت کو برقرار رکھا جائے کیونکہ باہمی اختلافات اور سیاسی ناچاقیاں ملی وحدت اور دین کے لئے مہلک ہوتی ہیں[۵۴]۔ قدامت پسند حلقوں میں اب بھی ہر حال میں اطاعت امیر پر زور دیا جاتا ہے حالانکہ ازمنہ وسطیٰ میں اس قسم کی تاکید، خاص حالات اور مواقع کے لئے تھی تاکہ ملی اتحاد کو اغیار اور دشمنان اسلام کی یلغار کے پیشِ نظر نہ صرف برقرار رکھا جائے بلکہ اسے نئے حالات اور تقاضوں کے مطابق مزید مستحکم کیا جائے۔ جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق ہے انہوں نے دینی قیادت کی شہ پر حکمران طبقہ کی سیاسی قیادت اس حد تک قبول کر لی کہ ان کے تحت ملک کا انتظام چلتا رہے، امن وامان قائم رہے، سرحدوں کی حفاظت ہوتی رہے، اعدائے دین سے جہاد ہوتا رہے اور عدالتوں کے ذریعہ انصاف کے تقاضے پورے ہوتے رہیں اور اسلامی قوانین کا اجراء برقرار رہے[۵۵]۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے اگر اس قیادت کو برداشت کیا جاتا رہا تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ علمائے دین ان کی حکومتوں کو خلافت راشدہ کی

مانند سمجھتے تھے بلکہ ان کی حکومت کو تسلیم کرنے میں یہ مصلحت کارفرما تھی کہ اب امت کی سیاسی قیادت انہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی اور ان کے خلاف محاذ آرائی ملت اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے مترادف تھی۔

اب جبکہ ملوکیت کا دور ختم ہو چکا ہے اور سلطانی جمہور کا زمانہ ایک بار پھر عود کر آیا ہے۔ ہمیں اسلام کے ابتدائی دور کی عملی سیاست سے یہ سبق مل چکا ہے کہ حکومت پر تعمیری تنقید ملکی سالمیت اور وحدت کے حدود کے اندر نہ صرف جائز ہے بلکہ لازمی ہے [1] ہمارا یہ مقدس فریضہ ہے کہ حکومت اور عوام میں دوئی کے تصور اور ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی کے مغربی انداز فکر کو خیرباد کہیں اور مکمل سیاسی ہم آہنگی کا ثبوت دیں۔ صرف تعمیری تنقید ہی سے سیاسی ہم آہنگی نشوونما پاتی ہے۔ لیکن اگر باہمی اعتماد، ہم آہنگی اور افہام و تفہیم مفقود ہو تو جائز اور تعمیری تنقید بھی قوم و ملت کے لئے خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سیاسی ہم آہنگی اعتماد کی فضا میں مل جل کر صبر و تحمل کے ساتھ مسائل پر بحث و تجسس کرنے، بردباری سے ایک دوسرے کے خیالات سمجھنے، رواداری کا مظاہرہ کرتے اور ایک دوسرے کے قریب تر آنے کی کوششوں سے پیدا ہو سکتی ہے لیکن ترقی پذیر ممالک میں مشکل یہ ہے کہ عموماً نہ تو حکمران طبقہ اہم ملکی اور بین الاقوامی مسائل پر حزب اختلاف کو اعتماد میں لینے کی کوشش کرتا ہے اور نہ سنجیدگی کے ساتھ اس کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی سعی کرتا ہے۔ اگر حکومت اس قسم کی کوشش کر بھی لے تو حزب اختلاف حکومت کے قریب آنے اور افہام و تفہیم سے مسائل کا حل ڈھونڈ نکالنے کو گوارہ نہیں کرتی۔ کیونکہ ان ممالک میں حزب اختلاف کا کردار عموماً منفی ہوتا ہے اور وہ "اختلاف برائے اختلاف" کے اصول کے تحت کام کرتی ہے۔

بسا اوقات تو حزب اختلاف کا طرزِ عمل ذاتی عناد، ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ملکی سالمیت کے لئے خطرے کا باعث بن جاتا ہے۔ حالانکہ آج سے چودہ سو سال قبل اسلام نے جب شوریٰ کا تصور پیش کیا تو فلسفہ یہ کارفرما تھا کہ اس کے ذریعہ افہام و تفہیم اور اعتماد کی فضا پیدا ہو گی اور آنے والی نسلیں سنت رسولؐ پر عمل کر کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے مسائل

باہمی مشورے سے حل کریں گی[۱۱] شوریٰ کے تصور کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ امت مسلمہ کے زعماء محاذ آرائی کے ذریعہ سادہ لوح عوام میں سیاسی سوجھ بوجھ کی کمی اور جذبات کی رو میں بہہ جانے کی روش سے غلط فائدہ اٹھا کر مسائل کو مزید پیچیدہ بنا دیں۔ اسلامی تاریخ کا یہی سبق ہے کہ شوریٰ ہی کی بدولت سیاسی اور معاشرتی ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس کے لئے افہام و تفہیم، اعتماد اور احساس ذمہ داری کی خوشگوار فضا موجود ہو۔ کیونکہ ان بنیادی عناصر کے بغیر نہ تو شوریٰ کی کوئی افادیت رہتی ہے اور نہ یہ مثبت نتائج تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ بلکہ شوریٰ غلط فہمیوں کی مکدر فضا میں مزید تلخیوں، ناچاقیوں اور محاذ آرائیوں کا سبب بن کر قومی وحدت کے لئے خطرناک صورت اختیار کر سکتی ہے۔

سیاسی جماعتوں کے ضمن میں ایک یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ آیا اسلام سیاسی جماعتوں کی اجازت دیتا ہے؟ بے شک اجازت دیتا ہے۔ لیکن حتمی نہیں بلکہ مشروط، اگر پارٹی بازی ذاتی اغراض و مقاصد کی خاطر ہو اور سیاسی جماعتوں کی موجودگی امت اسلامیہ کی وحدت کے لئے باعث افتراق ہو یا ان کے وجود سے قومی اور ملکی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو تو اسلام نے اس قسم کی گروہ بندیوں کی سختی سے ممانعت فرمائی ہے۔ قرآن واضح الفاظ میں حکم دیتا ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا ....[۱۲]

ترجمہ:۔ اور سب مل کر خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا۔

ہاں اگر پارٹیوں کا وجود مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ذرائع حصول مقصد (MEANS TO AN END) پر ہو اور اصولی اختلافات پر نہ ہو تو اسلام میں اس قسم کی گروہ بندیاں ممنوع نہیں کیونکہ ریاست کا انتظام بغیر سیاست کے ناممکنات میں سے ہے اور صحت مند سیاست پارٹیوں کی مرہون منت ہے۔

اسلام بلاشبہ آزادیٔ اجتماع (FREEDOM OF ASSOCIATION) کا حق تسلیم کرتا ہے بشرطیکہ وہ نیکی اور بھلائی کے لئے ہو نہ کہ معاشرے میں تفرقے اور بنیادی اختلافات پیدا کرنے کے لئے ــــ سیاسی جماعتیں ملکی فلاح و صلاح میں جو اہم کردار ادا کرتی ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بدلے ہوئے اور بدلتے حالات میں "سیاسی جماعت معاشرتی افکار (SOCIAL

(THOUGHT) اور سیاسی عمل (POLITICAL ACTION) کے درمیان مصالحت (MEDIATION) کا کردار ادا کرتی ہے۔[۳۱] لہٰذا ایک سیاسی جماعت کی جڑیں جس قدر مضبوط ہوں گی، اپنے مخصوص فلسفۂ حیات (IDEOLOGY) پر اس کے ممبران کا عقیدہ جس قدر راسخ ہوگا، اسے جس قدر عوام کی حمایت اور تائید حاصل ہوگی، جس قدر وہ فعّال اور متحرک ہوگی اور اس کی قیادت جس قدر مخلص، راست باز دیانت دار اور قابل افراد کے ہاتھوں میں ہوگی اسی قدر وہ مصالحت کے فریضے کو کما حقہٗ ادا کر سکے گی لیکن اگر سیاسی جماعتوں کا وجود محض باہمی رنجشوں، ذاتی مفادات اور حصولِ اقتدار کی خاطر ہو تو ایسی پارٹیوں سے بھلائی کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ ایسی جماعتیں قوم کو سوائے ذہنی انتشار، محاذ آرائی، مخاصمت اور باہمی رنجشوں کے اور کچھ نہیں دے سکتیں۔

جدید دور میں چونکہ صحت مند سیاسی جماعتوں کا نظام جمہوری عمل کے تقاضوں کو پورا کرنے اور معاشرتی افکار و سیاسی عمل کے درمیان مصالحت کا کردار ادا کرنے میں اہم حصہ لیتا ہے لہٰذا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ یک جماعتی نظام اس کام کو اس خوش اسلوبی سے سرانجام نہیں دے سکتا جو دو جماعتی نظام یا متعدد جماعتی نظام دے سکتا ہے۔[۳۲] ہاں البتہ یہ فرض سرانجام دیتے وقت یہ دیکھا جائے گا کہ آیا سیاسی جماعتیں محولہ بالا خصوصیات رکھتی ہیں یا نہیں۔ اس قسم کے نقطہ ہائے نظر ایک صحیح اور متوازن رائے عامہ کے لئے زیادہ سودمند اور بار آور ثابت ہو سکتے ہیں ایک ایسے خوشگوار اور پرسکون ماحول میں جو سیاسی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے وہ مضبوط اور ٹھوس بنیادوں پر قومی وحدت کا پیش خیمہ بنتی ہے جبکہ یک جماعتی نظام میں اس قسم کے نتائج وقتی طور پر تو حاصل کئے جا سکتے ہیں لیکن وہ دیرپا ثابت نہیں ہوتے۔ اور پھر یہ کہ اس نظام میں عام لوگوں کی دلچسپی رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے اور فیصلہ کا اختیار چند لوگوں تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسے حالات میں معاشرتی افکار اور سیاسی عمل کے درمیان مصالحت کا کردار ادا نہیں ہو سکتا۔

صدر اسلام کی سیاسی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ معاشرتی افکار اور سیاسی عمل کے درمیان مصالحت کے لئے اس وقت بھی گروہ بندیاں موجود تھیں گو یہ گروہ بندیاں آج کی سیاسی جماعتوں کی طرح منظم نہیں تھیں اور نہ اس لائن پر ان کی تنظیم کی

ضرورت تھی لیکن شوریٰ کے موقعوں پر یہ ابھر کر سامنے آجاتیں اور مسئلہ حل ہونے کے بعد خود بخود ختم ہوجاتیں۔ رسولِ کریمؐ کی وفات کے بعد بنو ہاشم کا علیؓ اور عباسؓ کے جھنڈے تلے اوس و خزرج (انصار) کا سعد بن عبادہؓ، بنو امیہ کا ابو سفیان اور باقی ماندہ قریشیوں کا ابو بکرؓ و عمرؓ کی سرداری میں مجتمع ہونا مسئلہ خلافت ہی کی وجہ سے تھا۔ ان میں سے ہر جماعت نے اپنے اپنے امیدواروں کے حق میں دلائل پیش کئے۔ تلخیاں بھی پیدا ہوئیں لیکن ابو بکر صدیقؓ کے انتخاب کے ساتھ اختلافات سرد پڑ گئے اور فتنۂ ارتداد پر قابو پانے کے لئے ان میں سے ہر فریق نے ابو بکرؓ کی سیادت میں خوش اسلوبی سے اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ کیا اب ہم اس قسم کی ہم آہنگی کا مظاہرہ کر کے ملک و ملت کو اندرونی و بیرونی سازشوں سے نہیں بچا سکتے ہیں؟ یقیناً بچا سکتے ہیں۔ صرف عالی حوصلگی بلند ہمتی اور رواداری کی ضرورت ہے۔

اس مثال کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی نظام فکر میں مثبت انداز استعمال کرتے ہوئے اگر سیاسی پارٹیوں کے درمیان فروعی اختلافات طریقۂ کار سے متعلق پیدا ہوں تو عوام کے سامنے مختلف حل آتے ہیں اور وہ زیادہ صحیح طور سے اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔ بقول ابو المنظر الاسفرائینی، "اختلافات اگر فروعی ہوں تو باعث صد رحمت ہوتے ہیں اور اگر اصول دین میں ہوں تو امت کی وحدت کے لیے خطرناک ہوتے ہیں"۔ خلافت کے مسئلہ پر صحابہ کرامؓ کے اختلافات مذہبی مسائل پر نہیں بلکہ جانشینی کے مسئلے پر تھے اور یہ خالص سیاسی نوعیت کے تھے جن کا حل انہوں نے باہمی مشوروں اور بحث و تمحیص سے ڈھونڈ نکالا۔ ان کے اس طرزِ عمل سے نہ صرف معاشرتی بلکہ سیاسی ہم آہنگی کا زبردست مظاہرہ ہوتا ہے۔ ہمیں اس روش کو اپنانا چاہیئے۔

خلفائے راشدین کے زمانے میں اکثر مسائل پر بحث و تمحیص کے وقت گروہ بنتے تھے جو خالص سیاسی نوعیت کے ہوتے تھے لیکن یہ گروہ آج کی سیاسی جماعتوں کی طرح مخالفت برائے مخالفت کے اصول پر گامزن نہیں تھے۔ انہوں نے منصب و جاہ کی خاطر کبھی بھی اخلاقیات سے روگردانی نہیں کی۔ وہ سیاست کو ذاتی مفاد اور اغراض کی بجا۔ یہ اخلاق کے تابع بناتے تھے اور اسے تقویٰ اور پرہیزگاری کے اصولوں کی روشنی میں چلاتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاتا

سکتا ہے کہ تعمیری تنقید کی قدر کی جاتی تھی اور اختلاف رائے کے باوجود مکمل سیاسی اعتماد، افہام و تفہیم اور ہم آہنگی کی فضا قائم و دائم رہتی تھی یہی وجہ تھی کہ عام لوگ کبھی بھی سیاسی محرومیوں کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ ہاں البتہ ملوکیت کے دور میں جب یہ فضا ختم ہوئی تو حالات یکسر بدل گئے اور تاریخ ایک نئے موڑ پر آگئی۔

پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں، جہاں جمہوری عمل اب پروان چڑھنے کی سعی کر رہا ہے اور ایک جدید ترقی یافتہ اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے کوششیں ہو رہی ہیں۔ جس کے لئے باہمی اعتماد، افہام و تفہیم، رواداری، بھائی چارہ اور احساس ذمہ داری کی اشد ضرورت ہے کیونکہ ہمیں بیک وقت صنعتی میدان میں بھی قدم جمانے ہیں معاشرتی مسائل سے بھی نمٹنا ہے اور اسلام کے اخلاقی اصولوں پر مبنی ایک ترقی یافتہ اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے اپنی کوششوں کو تیز تر کرنا ہے تاکہ ہم عالمگیر اخلاقی نظام کے قیام میں موثر کردار ادا کریں۔ اور انسانیت کے لئے امن، ترقی اور فلاح و صلاح کے کاموں میں حصہ لے سکیں۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوگا جب ہماری سیاسی جماعتیں ملکی سالمیت، قومی مفادات اور اسلام کی سربلندی کی خاطر مکمل سیاسی ہم آہنگی کا عملی ثبوت پیش کر دیں۔

ہماری نوجوان نسل میں مکمل افہام و تفہیم اور سیاسی ہم آہنگی ہی کی بدولت فکری شعور پیدا کیا جا سکتا ہے اور ان میں ذمہ داری اور رواداری کا احساس پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت ہماری تمام تر توجہ بامقصد تعلیم پر مرکوز ہے۔ نمائندہ حکومت تعلیم کی ترقی اور اس کے رستے میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے میں بڑی سنجیدگی سے کام کر رہی ہے۔ چونکہ تعلیمی اداروں میں فکری شعور پیدا کرنے اور مستقبل کی قیادت کی تیاری میں وقت لگتا ہے لہٰذا اس عمل کے ساتھ ساتھ ہمیں دوسرے ذرائع مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن، پریس اور سیاسی محرکات کو بھی فعال بنانا ہوگا تاکہ ترقی کی رفتار تیز ہو۔ چونکہ یہ ایک قومی فریضہ ہے لہٰذا ہمیں اسے بامقصد اور بار آور بنانے کے لئے گھسی پٹی اور نعرہ بازی کی سیاست کو خیرباد کہنا ہوگا اور جدید تقاضوں کے مطابق مکمل سیاسی ہم آہنگی کا عملی مظاہرہ کرنا ہوگا تاکہ قوم ذہنی انتشار سے بچ جائے۔ اس سلسلے میں

ہماری سیاسی جماعتوں کو ترقی کی رفتار تیز کرنے اور اہم قومی و بین الاقوامی مسائل حل کرنے کے لئے مثبت اندازِ فکر اپنانا ہوگا۔ ہماری بہتری اسی میں ہے کہ تمام سیاسی جماعتیں وسیع تر قومی مفادات کی خاطر قانونی سہارا لئے بغیر اپنے لئے ایک ایسا ضابطۂ اخلاق مرتب کرکے اس پر عمل درآمد شروع کریں جس سے جمہوری عمل کو دھچکا بھی نہ لگے اور سیاسی ہم آہنگی کا باعث بھی بنے۔ امن و امان، اتحاد و اتفاق اور نظم و ضبط کے بغیر نہ تو قوم کی صلاح و فلاح کے کام ہو سکیں گے۔ اور نہ ملک ترقی کی دوڑ میں دوسرے ممالک کے شانہ بشانہ چل سکے گا۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام تمام مسلمانوں کو متحد رہنے کا حکم دیتا ہے لیکن اتحاد و اتفاق کا جو تصور قرآن پیش کرتا ہے یا رسول اللہؐ نے ایک مثالی معاشرہ قائم کرکے دکھایا تھا اس میں قانون کے سہارے کا کم اور اخلاق کی تعمیر کا زیادہ عمل دخل تھا۔ زبردستی بنائی گئی وحدت یا ہم آہنگی اس وقت تک دیرپا ثابت نہیں ہوسکتی جب تک کہ اخلاق کی تعمیر نہ ہو، دلوں میں خدا کا خوف اور اسلام کی محبت موجزن نہ ہو۔ لہٰذا ایک اسلامی ریاست میں اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ صحیح اور متوازن قسم کے افکار و خیالات پر کسی قسم کی پابندی عائد کی جائے۔ اس قسم کا طرزِ عمل سیاسی ہم آہنگی کے رستے میں روڑے تو اٹکا سکتا ہے لیکن بامقصد اور مثبت نتائج کے حصول کے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔ اسلامی فلسفۂ حیات کی رو سے زندگی کا راز انفرادی اور اجتماعی قوتوں کی آزادی اور نشو و نما میں مضمر ہے نہ کہ ان پر پابندیوں اور ان کی جکڑبندیوں میں۔ افراد کے رجحانات کو کچلنے اور ان کے میلانات کو دبانے کا اثر صرف ان کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ ملتِ اسلامیہ کے لئے ان کی صلاحیتوں اور خدمات سے استفادہ کے مواقع کو ختم کردیا جاتا ہے۔ ملت کے مفاد کی خاطر شخصی آزادی کے رجحان کو اس حد تک پابند کرنا چاہیئے کہ جہاں وہ زندگی کے بلند تر مقاصد سے ٹکرائے اور ملی مفادات پر زد پڑے یا ایسا احتمال ہو۔ بالفاظ دیگر اسلامی نظامِ حیات میں فرد اور ملت کے درمیان نظر بہ انفرادیت اور اجتماعیت کے برعکس ایسا توازن قائم کیا گیا ہے کہ نہ تو معاشرہ کو مختارِ مطلق بنا کر فرد کو بے بس کردیا گیا ہے اور نہ ہی فرد کو بے لگام آزادی دے کر خود سر اور اجتماعی مفادات کا

دشمن بنادیا گیا ہے۔ اس تعلق کو مفکر اسلام شاعر مشرق علامہ اقبال نے بڑے پیارے انداز میں پیش کیا ہے:

فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، حصول مقصد کے ذرائع پر حکومت وقت کی پالیسیوں کی تعمیری تنقید اسلام کی نظر میں ممنوع نہیں بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے[۵۱] لیکن چونکہ اسلام کے نزدیک زندگی باہمی کشمکش یا جنگ وجدال کا نام نہیں بلکہ مکمل ہم آہنگی، باہمی اشتراک، تعاون اور ہمدردی کا نام ہے اس لئے تنقید باہمی اعتماد اور احساس ذمہ داری کی حدود کے اندر ہو البتہ جس قسم کی تنقید یا مخالفت کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے وہ تخریبی طرز عمل ہے جس سے امن وامان کی صورت حال بگڑنے کا اندیشہ ہو یا جس سے لوگوں کو قانونی حکومت کے خلاف غیر قانونی یا غیر آئینی اقدامات پر آمادہ کیا جا رہا ہو۔ اسی طرح لوگوں میں مایوسی پیدا کرنے اور حکومت کے خلاف خوامخواہ بد دلی کے جذبات ابھارنے والوں کا بھی سختی سے محاسبہ ہونا چاہیئے۔

جدید دور کے مسلم معاشرہ میں ذہنی انتشار و پراگندگی اور سیاسی ہم آہنگی کے فقدان کی ایک بڑی وجہ مغرب کی اندھا دھند تقلید ہے۔ اس تقلید نے جہاں ہمارے معاشرے میں بہت سی سماجی برائیاں پیدا کی ہیں وہاں ہمیں فرائض اور احساس ذمہ داری کے بغیر حقوق اور ان کے تحفظ کا تصور بھی دیا ہے حالانکہ خود مغربی مفکرین کے بقول علم سیاسیات میں حقوق و فرائض کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ فرائض کے بغیر محض حقوق کا تصور نراجیت (ANARCHISM) کی طرف دھکیلتا ہے جبکہ بغیر حقوق کے صرف فرائض کا مطالبہ اجتماعیت (COLLECTIVISM) کی جانب لے جاتا ہے۔ اس وقت مسلم دنیا میں افراد اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے آپس میں برسر پیکار ہیں۔ افراد اور حکومتیں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہیں حالانکہ ہماری زندگی کا تصور ہی مغربی دنیا سے مختلف ہے۔ اس قسم کی سیاسی کشمکش میں شوریٰ بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح مغربی طرز پر چلنے والی خود ساختہ جمہوری حکومتوں میں ایک

طرف عوام کے باہمی تعلقات اور دوسری طرف عوام اور حکومت کے تعلقات محض مشینی اور قانونی حد تک رہ گئے ہیں لیکن اگر اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں باہمی اعتماد، افہام و تفہیم، رواداری اور معاشرتی و سیاسی ہم آہنگی کی فضا پیدا کی جائے تو یہ تعلقات ہرگز مشینی نہیں ہوں گے اور نہ انہیں قدم قدم پر قانونی سہاروں کی ضرورت پڑے گی۔ قرآن بڑے واضح الفاظ میں اعلان کرتا ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں [۵۱] وہ ایک ہی برادری کے ارکان ہیں۔ ہمارے نظام حیات میں اونچ نیچ کا کوئی تصور ہی نہیں۔ حقوق میں چھوٹے بڑے، حکمران و رعایا، مزدور و کسان، سب کا درجہ ایک ہے اور ذمہ داری بھی یکساں ہے۔ افراد کے تعاون، مل جل کر کام کرنے اور ہمدردی کی وجہ سے امتِ مسلمہ میں وحدت و یگانگت کے جذبات پروان چڑھ سکتے ہیں اور سیاسی استحکام پیدا ہو سکتا ہے۔

اسلام کی سربلندی، ملکی سالمیت و بقاء، اتحاد و اتفاق اور بھائی چارے کی خاطر وقت کی سب سے اہم ضرورت پاکستان میں مکمل سیاسی ہم آہنگی ہے اس کے بغیر وہ بلند و بالا مقاصد حاصل نہیں ہو سکیں گے جن کی خاطر پاک و ہند کے مسلمانوں نے عظیم قربانیاں دے کر پاکستان حاصل کیا تھا۔ سید جمال الدین افغانی، علامہ محمد اقبال اور بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح کے عظیم تر مسلم اتحاد اور عالم گیر انسانی برادری کے خواب اس وقت شرمندۂ تعبیر ہوں گے۔ جب ہم مکمل اتحاد اور سیاسی ہم آہنگی کا مظاہرہ کریں ہر قسم کے داخلی اور خارجی سیاسی معاشرتی اور معاشی بحرانوں پر قابو پالیں۔ اور پہلے سے بھی زیادہ عزم و ہمت کے ساتھ ملک و ملت کی خدمت کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ اس وقت موجودہ حکومت عوام کی تائید و حمایت سے اسلامی اتحاد اور بھائی چارے کے لئے جو کوششیں کر رہی ہے وہ اس وقت بارآور ثابت ہوں گی جب ہم مکمل اتحاد، یک جہتی اور ہم آہنگی کا مظاہرہ کریں گے۔ تاریخ کا ہمارے نام یہی پیغام ہے کہ ہم اپنی تمام تر توجہ اسلام کی سربلندی، اس کے حصاروں کی مضبوطی، ملکی سالمیت و بقاء کی حفاظت اور عالم گیر مسلم اتحاد و برادری کے استحکام پر مرکوز کریں تاکہ ماضی کی طرح مسلمان قوم ایک بار پھر بھٹکی اور دکھی انسانیت کی رہنمائی کرنے کے قابل ہو۔

ہمیں یقین ہے کہ پاکستانی مسلمان اس ضمن میں بہت کچھ کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ نظریہ پاکستان پر صدق دل سے عمل پیرا ہوں اور اپنی صفوں میں مکمل اتحاد پیدا کریں۔ ہمیں بھارت اور بنگلہ دیش کے حالیہ واقعات کے پیشِ نظر عملی طور پر ثابت کرنا ہے کہ مطالبہ پاکستان دشمنی یا جذبات کی پیداوار نہیں تھا بلکہ ایک حقیقت کا اظہار تھا اور یہ کہ ہم آپس میں فروعی اختلافات رکھتے کے باوجود پاکستان کا تحفظ کرنا جانتے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ رسول کریمؐ نے مکّہ میں، جبکہ ابھی اسلام کی روشنی پوری طرح نہیں پھیلی تھی اور قبائلی عصبیت پورے زوروں پر تھی، اپنے پیروں کے درمیان مؤاخاۃ قائم کی، انسانی مساوات کا عملی نمونہ پیش کیا اور کفار مکہ اور دوسرے لوگوں پر واضح کیا کہ اسلام فرقہ پرستی، رنگ و نسل اور قبیلوں سے بالاتر ہے۔ اس مؤاخاۃ کی تفصیل کے لئے دیکھئے (ابن حبیب کی کتاب "کتاب المُحبّر" مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۴۲ء ص ۷۱-۷۰) مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد آپ نے سب سے پہلے عظیم تر اتحاد کی خاطر قریش اور انصار کے درمیان مؤاخاۃ کی بنیاد رکھ دی (تفصیل کے لئے دیکھئے ابن سعد: طبقات الکبرٰی (بیروت ۱۹۵۷) جلد اول ص ۲۳۸-۳۹) اس بھائی چارے کی بدولت انصار نے خوشی سے اپنے مکی بھائیوں کو اپنے مکانوں، جائدادوں اور باغوں میں اپنا حصہ دار بنایا اور ان کی طرف مکمل دست تعاون بڑھایا (ابن کثیر: البدایۃ والنہایۃ جلد سوم، قاہرہ ۱۹۳۲ء ص ۲۲۶-۸) یہ وہ بھائی چارہ تھا جس نے آگے چل کر عالم گیر انسانی برادری کی بنیاد ڈال دی۔ قرآن کریم بار بار اس بھائی چارے کا تذکرہ کرتا ہے اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کے کاموں میں تعاون کی تلقین کرتا ہے۔ دیکھئے قرآن: III : ۱۰۳، XV : ۴۷، IX : ۱۱، XXXIII : ۵ اور V : ۲)

۲۔ قرآن: III : ۱۵۹، XLII : ۳۸

۳۔ اس قسم کی احادیث کے لئے دیکھئے امام بخاری: الجامع الصحیح۔ کتاب الاحکام کراچی ۱۹۶۱ء، جلد دوم ص ۱۰۵۷-۵۸

۴۔ قرآن: V : ۲

۵۔ دیکھئے امام غزالی کی کتاب: المستظہری (لیدن ۱۹۵۶) ص ۷۲ اور الاقتصاد فی الاعتقاد، قاہرہ ۱۳۲۰ھ ص ۱۰۷

۶:۔ ابن جماعۃ کے ان خیالات کو مجید خدوری نے اپنی کتاب "اسلام میں قانون جنگ وامن (انگریزی) بالٹیمور ۱۹۶۰ء" میں صـ۱۳ پر نقل کیا ہے۔

۷: اس موضوع پر دیکھئے وہ روایات جو امام ابو یوسف نے اپنی مشہور کتاب "کتاب الخراج، مطبعہ سلفیہ مصر ۱۳۸۲ھ) میں صفحہ ۱۰-۹ پر جمع کی ہیں۔

۸: یحی بن شرف النووی: شرح الصحیح لمسلم (کراچی ۱۳۴۹ھ) جلد دوم صـ۱۲۴

۹: اس ضمن میں دیکھئے امام غزالیؒ کی کتاب "الاقتصاد فی الاعتقاد، صـ۱۰۱

۱۰: خلفائے راشدین اس اصول پر سختی سے کاربند تھے۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ تعمیری تنقید کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ امام ابو یوسف کی روایت کے مطابق ایک دفعہ حضرت عمرؓ خطبہ دے رہے تھے۔ مجمع میں سے ایک شخص بار بار "اللہ سے ڈرو" کے الفاظ کہہ رہا تھا پاس ہی ایک شخص نے کہا۔ بس کرو بہت ہو چکا۔ حضرت عمرؓ فرمانے لگے۔ اسے کہنے دیجئے۔ اگر آپ لوگ تنقید نہیں کریں گے تو کس کام کے اور ہم نہیں سنیں گے تو ہمارے لئے خیر نہیں (کتاب الخراج، صـ۱۲)۔

۱۱: شوریٰ کی احادیث، فرضیت اور اصولوں کے لئے دیکھئے ابن جریر الطبری کی تفسیر جامع البیان لاحکام القرآن (تالیف محمود شاکر) جلد دوم (تاریخ ندارد) صـ۴۶-۳۴۵۔

۱۲: قرآن: III : ۱۰۲

۱۳: ارنسٹ بارکر: پرنسپلز آف سوشل اینڈ پولیٹیکل تھیوری، آکسفورڈ ۱۹۵۶ء، صـ۲۰۹

۱۴: ایضاً صـ۲۱۰-۲۱۱

۱۵: الفرڈ گیام: دی لائف آف محمدؐ (انگریزی ترجمہ سیرۃ ابن اسحاق) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، لاہور، ڈھاکہ ۱۹۶۸ء صـ۶۸۳

۱۶: ابی المظفر الاسفرائینی: التبصیر فی الدین ... مصر/بغداد ۱۹۵۵ء، صـ۲۶

۱۷: دیکھئے حوالہ ۱۰

۱۸: قرآن: سورۃ الحجرات: ۱۰، ۱۳۔